حافظ محمود شیرانی :

شہادتِ کلام

(ادبی تحقیق کا ایک انداز تو یہ ہے کہ واقعاتی شہادت کی رو سے بحث کی جاتی ہے، دوسرے) اسی مقصد کے لیے ایک اور پہلو سے بحث کی جاتی ہے۔ اس سے ہمارا مقصد شہادتِ کلام ہے۔ شہادتِ کلام ہمارے پاس ایک ایسا زبردست آلہ ہے جس کی رہنمائی میں ہم ایک یقینی اور قطعی فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ امتدادِ زمانہ اور انقضاے ایام کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ سیاسی انقلاب جس طرح قوموں کے مستقبل کی تاریخ بدل دیتے ہیں اسی طرح زبان کا مستقبل بھی تغیرات سے محفوظ نہیں رہتا۔ ہر وقت اور ہر عصر کی زبان میں مختلف نوعیت کی خصوصیت مشاہدہ کی جاتی ہے جو اس کو دوسرے ازمنہ کی زبان سے ممیز کرتی ہے۔ جوں جوں ایک قوم تمدن اور معاشرت کے مدارج میں ارتقا حاصل کرتی ہے اس کو نئی ضروریات قدم قدم پر لاحق ہوتی ہیں۔ نئی ضروریات، نئے الفاظ اور نئی اصلاحات ایجاد کرتی ہیں اور جس طرح ہم پرانا لباس بدن سے اتارکر پھینک دیتے ہیں اسی طرح مندرس اور پارینہ الفاظ ایک فرسودہ سکے کی طرح ٹکسال سے خارج کردیے جاتے ہیں۔ زبان کی نبض شناسی کے لیے لازم ہے کہ ہم اس کے تدریجی تغیر و تبدل کی تاریخ اور الفاظ کے حقائقِ زیست و ممات سے بالکلیہ واقف ہوں۔

ایک اور اصول ہے جس کا علم ہر محقق کے لیے ضروری ہے۔ انسان جس طرح شکل، صورت، رنگ و لون، اخلاق و طبائع اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح اظہارِ خیالات اور ادائے مطالب میں ایک دوسرے سے منفرد ہیں۔ تمثیلاً اگر ایک عہد کے دو انشاپرداز لیے جائیں جو ایک ہی مضمون پر طبع‌آزمائی کر رہے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں ادائے مضمون، انتخابِ الفاظ اور اسلوبِ کلام میں نمایاں تفاوت ہوگا۔ باوجود اس اختلاف کے دونوں معاصروں کی تحریر میں ایک مماثلت قریب بھی مشاہدہ کی جائے گی جو بوجہ معاصرت دونوں میں عام ہے، کیوں کہ ہر چیز پر خواہ وہ مصنوعاتِ دماغی سے تعلق رکھے یا مصنوعاتِ دستی سے، زمانہ اپنا داغ ضرور چھوڑتا ہے۔ اور وہ خاتم جس کو ایام نے کسی چیز پر ثبت کیا ہے اس کے نقوشِ نگیں کو کوئی ہاتھ نہیں مٹاسکتا۔ اس خصوصیت کو **اسالیبِ ایامی** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

علیٰ ہذا بعض خصوصیات اس قسم کی ہیں جو کسی خطۂ ملک میں رائج ہیں۔ اگر مصنف اسی حصۂ ملک کا باشندہ ہے تو یہ مقامی خصوصیت اس کے کلام میں بھی پائی جائے گی، مثلاً ہم شاہ نامے میں دیکھتے ہیں کہ فردوسی نان بائی کو نانواء، ساربان کو ساروان اور برزیگر کو ورزیگر اور پیش‌باز کو پیش‌واز لکھتا ہے۔ اس سے ہم یہ قیاس مرتب کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ فردوسی اور اس کے ہم وطنوں میں یہ الفاظ بائے ابجد کو واو ہوز سے بدل کر تلفظ کیے جاتے تھے۔ اس خصوصیت کا نام **اسالیبِ مقامی** رکھا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ ہر مصنف، خواہ وہ کسی پائے کا کیوں نہ ہو، الفاظ کا ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے جس کے ذریعے

سے وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے ۔ اس ذخیرے میں بعض الفاظ، تراکیب، محاورات، کنایات، تشبیہات، صفات اور استعارات اس قسم کے ہوں گے جو مصنف کے نزدیک زیادہ مقبول اور مطبوع ہوں گے ۔ اس بنا پر ان کا استعمال بالارادہ یا بلا ارادہ تحریر میں زیادہ کرے گا کیوں کہ وہ اس کے روزمرہ ہو چکے ہیں اور یہ سرمایہ اس کی تحریر کا اسلوب خصوصی ہے ۔

جس طرح ایک مصور کسی شخص کی تصویر میں اس کی ظاہری شکل و صورت اور خط و خال رنگوں کے ذریعے دکھاسکتا ہے، اسی طرح ایک منتقد کسی مصنف کی ان تمام خصائص کی جو اس کی تصنیف کے مخصوصی خط و خال ہیں، سراغ رسانی کرسکتا ہے اور اس سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کسی شاعر کا قول ہے:

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ

جب صاحبِ بصیرت کے نزدیک ایک خشت دفترِ احوال کی ایک فرد ہے تو ایک کتاب جو مصنف کے دل و دماغ کا عکس، خیالات، معلومات اور معقولات کا آئینہ ہے اور جس میں اس نے اپنی شخصیت کی تمثال کو الفاظ کے جامے میں یادگار چھوڑا ہے، نظرِ امعان میں اس صاحبِ تصنیف کی ہستی کو مشخص اور اس کے وجود کو دوسرے افراد سے جداگانہ شخصیت تسلیم کروانے کے لیے کیا قابلِ اعتبار شہادت نہیں بن سکتی جس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرہ حقیقت میں بجائے خود ایک تاریخ ہے ؟

جب ایک ماہرِ آثارِ قدیم کسی شکستہ و ریختہ عمارت پر نظر ڈال کر اس کی عمومی وضع، محرابوں کی ہیئت، گنبدوں کی ساخت، ستونوں کی نقاشی و نقاری، چھت اور دیواروں کی گل‌کاری اور نقش و نگار

سے اس کی تعمیر کا صحیح زمانہ قائم کرسکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک محقق کسی کتاب کے مقالات، کنایات اور محاورات کو دیکھ کر اس کے عہدِ تصنیف کا سراغ نہ لگا سکے۔

(مقالہ "یوسف و زلیخائے فردوسی" ۱۹۲۲ء سے ماخوذ)